بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(بحضور (ﷺ) شاہنشاہِ بوریہ نشینؐ)

اسلامی مملکتؔ کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں

عصرِ حاضر کا ایک ماہرِ سیاسیات، پروفیسر مینکن (H.J.Mencken) دنیا کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لینے کے بعد بصد حسرت و یاس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ:

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع اور سب سے زیادہ عقل مند ہے اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرات آزما ہیں لیکن جب ان کے عملی نفاذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور ارباب حکومت پبلک کے خادم ہیں لیکن جب حکومت کو عملاً قائم کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد عوام کی خدمت کے بجائے انہیں لوٹنا کھسوٹنا ہو جاتا ہے۔

(Treatise of Right and Wrong)

اس مؤرّخ نے بے شک اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن نظر آتا ہے کہ تاریخ کا

ایک باب یا تو اس کی نگاہوں سے اوجھل رہا اور یا اس نے اسے عملاً نظر انداز کر دیا۔ اس لئے کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ باب ایک غیر جانبدار مؤرّخ کے سامنے آئے اور وہ انسان کی اس کامیابی کا تذکرہ نہ کرے جس کی رو سے اس نے دنیا کو بتا دیا کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس میں حکومت کا فریضہ عوام کے خدام کی حیثیت سے ان کی ضروریات زندگی مہیا کرنا ہو اور یہ فریضہ محض نظری طور پر اس کے سامنے نہ ہو بلکہ وہ حکومت اسے عملاً پورا کر کے دکھا دے۔ یہ نظام قائم ہوا تھا' آج سے قریب چودہ سو سال پہلے' محمد رسولؐ اللہ والذینؓ معہٗ کے انسانیت ساز ہاتھوں سے' جس سے دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ انسان اگر وحی کی راہ نمائی میں اپنا معاشرہ متشکل کرے تو کس طرح اس کی ناکامیاں' کامیابیوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ زمانی اعتبار سے اس نظام کی مدت بڑی مختصر سی تھی۔ لیکن جہاں تک اثر انگیزی کا تعلق ہے' دنیا کی کوئی تاریخ بھی اس کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس نظام کے متعدد گوشے ہیں جن میں سے ہر گوشہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ جو حکومت مستقل اقدار خداوندی کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اس کا ہر قدم کس طرح تعمیرِ انسانیت کے لئے اٹھتا ہے لیکن چونکہ پروفیسر منکنؔ نے ان میں سب سے زیادہ اہمیت اس گوشے کو دی ہے جس کا تعلق عوام کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرنے سے ہے اور ویسے بھی ہمارے اس دور میں معاشیات نے خاص اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اسے تو کہا ہی عہد اقتصادیات (Age of Economics) جاتا ہے اور کسی نظام کے حسن و قبح کے ماپنے کا پیمانہ ہی یہ قرار پا گیا ہے کہ وہ عوام کی معاشی مشکلات کا حل کیا پیش کرتا ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ عید میلاد النبیؐ کی اس تقریب سعید پر خصوصیت سے اس گوشے کو سامنے لاؤں۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لئے وہ کس طرح اپنی زندگی کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوئی حکومت بھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتی جب تک اس کے سربراہ ان اصولوں پر خود عمل کر کے نہ دکھائیں جنہیں اس حکومت کی اساس قرار دیا جاتا ہو۔

اسلامی حکومت کا بنیادی اصول:

اسلامی حکومت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)

روئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

اسلامی حکومت جو خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے' خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔اس لئے وہ افراد مملکت سے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتی ہے:

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (6:151)

ہم تمہاری ضروریات زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔

وہ ان میں سے ہر فرد کو اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۙ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (20:118-119)

ہم ایسا جنتی معاشرہ متشکل کریں گے جس میں تمہیں نہ بھوک کی پریشانی ہوگی نہ لباس کی نہ پیاس کی تکلیف ہوگی نہ سردی گرمی سے بچنے کی۔اس میں روٹی' کپڑا اور مکان وغیرہ تمام افراد کو میسر ہوگا۔اس کی ذمہ داری ہمارے سر پر ہوگی۔

آپ غور کیجئے یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جسے یہ مملکت اپنے سر پر لیتی ہے۔اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اس گراں بار ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس مملکت کا سربراہ اپنی زندگی کس قسم کی بسر کرتا ہے۔اس مملکت کے سب سے پہلے سربراہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

حضور ﷺ کی مکی زندگی:

آپؐ کی حیات طیبہ کے دو ادوار ہیں۔ایک مکی زندگی دوسری مدنی۔مکی زندگی میں یہ مملکت قائم نہیں ہوئی تھی۔لیکن حضورؐ اس جماعت کی تشکیل و ترتیب میں مصروف تھے جس کی

رفاقت سے یہ مملکت قائم ہوئی تھی۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ آپؐ کی مکی زندگی بڑی عسرت اور تنگدستی کی تھی لیکن یہ صحیح نہیں۔ خدا نے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى (93:8) ''ہم نے تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا''۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وہ زندگی ایک ''غنی'' کی زندگی تھی۔ یعنی ایسی زندگی جس میں آپ ﷺ کو اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑتا تھا لیکن وہاں جماعت کے افراد کی ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں اس وقت حضور ﷺ کا اسلوب کیا تھا۔ اس کا اندازہ صحیحین کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے:

> حضرت ابوموسیٰ اشریؓ سے روایت ہے کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا یا ان کے ہاں بال بچوں پر ویسے فاقہ کی نوبت آ جاتی تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔
>
> رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں حضورؐ اور جماعت مومنین کا انداز زیست ایسا تھا کہ اپنی اپنی ضروریات کی چیزوں کو سب اکٹھا کر لیتے اور پھر اس میں سے حصہ رسدی لے لیتے۔ چونکہ اس وقت جماعت میں اکثریت محتاجوں اور ناداروں کی تھی' اس لئے ظاہر ہے کہ اس مساواتی تقسیم میں ہر ایک کے حصے میں کس قدر آتا ہوگا۔ جو کچھ دوسروں کے حصے میں آتا ہوگا' وہی کچھ حضورؐ کے حصے میں آتا ہوگا' بلکہ اس سے بھی کم' اس لئے کہ قرآن کریم نے مومنین کا انداز زیست یہ بھی تو بتایا ہے کہ:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ (59:9)

> وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں ہی گزارا کرنا پڑے۔
>
> اور حضورؐ سب سے پہلے اس پر عمل پیرا ہوتے ہوں گے۔

مدنی زندگی:

حضور ﷺ کی مدنی زندگی میں ایک مملکت وجود میں آ گئی۔ آپ ﷺ دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ تھے۔ مولانا شبلی (مرحوم) کے الفاظ میں:

یہ وہ زمانہ تھا جب تمام عرب، حدود شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا تھا اور مدینہ کی سرزمین میں زروسیم کا سیلاب آ چکا تھا۔

(سیرت النبیؐ، جلد اوّل، صفحات 352-349)

لیکن اس کے باوجود آپؐ نے جس انداز کی زندگی بسر کی اس کے متعلق کتب تاریخ وسیر میں ہے کہ:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کا کوئی کپڑا تہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا، دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہ کر کے رکھا جاتا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔

(سیرت النبیؐ، جلد اوّل، صفحات 352-349)

عسرت کی زندگی کیوں؟:

اس پر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس قدر وسیع علاقہ آپ کے زیر نگیں تھا، اتنی بڑی سلطنت کے آپؐ سربراہ تھے۔ مدینہ میں زروسیم کا سیلاب آ چکا تھا تو پھر آپ اس قدر عسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ مملکت کے وجود میں آ جانے سے حضورؐ کی ذمہ داریوں میں بھی تو اسی نسبت سے اضافہ ہو گیا تھا۔ ملک میں خوشحال لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ باقی سب مفلوک الحال، ضرورت مند، مفلس اور نادار تھے، جن کی کفالت مملکت کے ذمے تھی۔

سربراہ سب سے پیچھے:

دنیا کی عام مملکتوں میں رئیس مملکت یا دیگر ارباب حکومت کے اخراجات کے لئے سب سے پہلے رقم الگ کر لی جاتی ہے اور جو باقی بچتا ہے اس میں سے دیگر مدات پر صرف کیا جاتا ہے

لیکن اسلامی مملکت میں صورت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس میں سربراہ مملکت اپنی ضروریات کو سب سے مؤخر رکھتا ہے۔ وہ اس وقت کھاتا ہے جب سب کھا چکتے ہیں۔ وہ اس وقت پہنتا ہے جب سب پہن چکتے ہیں۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنادے اور وہ لوگوں کی ضروریات اور احتیاجات سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے گا۔

(ابوداؤد، کتاب الخراج)

یہی روایت ترمذی میں ان الفاظ میں آئی ہے:

حضورؐ نے فرمایا جو امام ضرورت مندوں، محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

(ترمذی، کتاب الاحکام)

اس تفصیل کو حضورؐ نے چند الفاظ میں سمٹا کر یوں بیان فرمایا کہ

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند احمد)

کوئی فرد تنہا نہ رہنے پائے:

مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ کسی فرد کو محسوس تک نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا کہ:

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔

(ترمذی۔ باب الفرائض)

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں وفات پا جائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو اور وہ تنگدستی کی وجہ سے اس قرض کو ادا نہ کر سکا ہو تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی مملکت کے ذمہ ہو گی۔ حضورؐ

نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ:

میں مسلمانوں سے ان کے اپنے افراد کی نسبت زیادہ قریب ہوں۔ سو ان میں سے جو مقروض وفات پا جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔

(ابوعبید۔ کتاب الاموال)

ہر متنفس کے رزق کی ذمہ داری:

مملکت کی یہ ذمہ داریاں صرف انسانوں تک محدود نہیں چونکہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ''زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں' جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو''۔ اس لئے اسلامی مملکت کے حدود میں رہنے والے ہر متنفس کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہوتی ہے اس لئے حضرت عمرؓ نے جو اسلامی مملکت کے تیسرے سربراہ اور حضورؐ کے جانشین تھے' فرمایا تھا:

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ (توفیق الرحمٰن)

حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسلامی مملکت کا رقبہ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل تک پھیل چکا تھا اور ایک عراق کی مال گذاری ساڑھے گیارہ کروڑ درہم تھی لیکن اسی نسبت سے افرادِ مملکت کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور مملکت کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ افرادِ مملکت کے رزق کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وسائلِ پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں۔ وسائلِ پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے اور قرآن کریم کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا اعلان ہے کہ اَلْاَرْضِ لِلّٰهِ ۔ ''زمین اللہ کی ہے''۔ اس پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۔ (41:10) ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کھلا رہنا چاہئے۔ اس کی تشریح میں حضورؐ نبی اکرمؐ نے اعلان فرمایا کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے

بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہئے۔(ابوداؤد)

اس اعلان عظیم کا نتیجہ تھا کہ زمین پر ذاتی ملکیتیں ختم ہوگئیں اور زمیندار اور مزارع کی کوئی تفریق نہ رہی۔ آج کل ہمارے ہاں سود کی بحث نے بڑی اہمیت حاصل کر رکھی ہے لیکن یہ بحثیں بنک کے سود تک محدود ہیں۔ یہ بات کوئی نہیں بتاتا کہ حضورؐ نبی اکرم نے زمین کی بٹائی (مزارعت) کے معاملہ کو بھی سودی کاروبار قرار دیا ہے۔ حضرت ابن ابی نعیمؓ کی روایت ہے:

(حضرت) رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت پر لی۔ وہ اس کی آبیاری کر رہے تھے کہ حضورؐ ادھر سے گزرے اور پوچھا کہ یہ کھیتی کس کی ہے' اور زمین کس کی؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ لہٰذا' زمین صاحب زمین کو واپس کر دو' اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہے اسے اس سے وصول کر لو۔(ابوداؤد)

ایک اور روایت میں اس اصول کی مزید تشریح ان الفاظ میں آئی ہے:

رسولؐ اللہ سے سوال کیا گیا کہ کیا زمین کا مالک کاشتکار سے تھوڑا بہت اناج بھی نہیں لے سکتا؟ فرمایا نہیں۔ پھر سوال کیا گیا اچھا غلہ نہ سہی' بھوسہ تو لے سکتا ہے؟ فرمایا۔ بالکل نہیں۔(نسائی)

اس لئے کہ جب زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو ہی نہیں سکتی تو حق ملکیت کیسا؟ زمین خدا کی اور اس میں پیداوار کے تمام اسباب وعناصر بھی اس کے عطا کردہ۔ پھر زمین کا ''خود ساختہ'' مالک کس بات کا معاوضہ لیتا ہے؟ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے' کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہء گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، میری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، میری نہیں، تیری نہیں!

''زمین کے مالک اور مزارع'' کا سوال تو ایک طرف رہا، وہ حضرات اس باب میں اس قدر محتاط تھے کہ حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت عبدؓ اللہ کا بیان ہے کہ

''میں نے کچھ اونٹ خریدے اور انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا۔ وہ فربہ ہو گئے تو انہیں بازار میں فروخت کرنے کے لئے آیا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کا گزر اس طرف سے ہوا۔ انہوں نے پوچھا کہ ایسے فربہ اونٹ کس کے ہیں؟ میں نے جواب دیا تو پوچھا کہ یہ ایسے موٹے تازے کس طرح ہو گئے ہیں؟ میں نے کہا کہ میں نے انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا تھا تا کہ جو فائدہ دوسرے مسلمان اٹھاتے ہیں میں بھی اٹھاؤں''۔

یہ سن کر آپؓ کو سخت غصہ آیا اور کہا کہ عام مسلمانوں کا ذکر کیوں کرتے ہو! کہو امیر المومنین کے بیٹے کے اونٹ تھے اس لئے حکومت کی چراگاہ میں بھیج دیئے۔ سنو! اونٹ فروخت کرواور راس المال رکھ کر منافع بیت المال میں جمع کرادو۔

(شاہکار رسالت، ص:321)

خلیفہ کا حصہ:

یہ تو خلیفہ کے بیٹے کی بات تھی۔ خود خلیفہ بیت المال میں اپنا حصہ کس قدر سمجھتا تھا۔ اس کے متعلق جب حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا، تو آپؓ نے فرمایا:

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک جاڑے کا اور دوسرا گرمی کا، حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام اور میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم، اس کے بعد، میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں، جو ان کا حال سو میرا حال۔ (عمر فاروقؓ، از محمد حسین ہیکل)

وہ فرمایا کرتے تھے کہ

اللہ کا مال میرے لئے ایسا ہے جیسے کسی یتیم کا مال' ضرورت نہیں ہوتی تو اسے ہاتھ نہیں لگاتا اور حاجتمند ہوتا ہوں تو بقدر احتیاج لے لیتا ہوں۔ (ایضاً)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وظیفہ:

حضرت ابوبکرؓ صدیق کا فیصلہ اس سے زیادہ ایمان افروز ہے۔ وہ کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ جب آپؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ آپ کا سارا وقت ملّت کا ہو گیا ہے۔ آپؓ اسے اپنی ذاتی ضروریات کے لئے صرف نہیں کر سکتے۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر خلیفہ اور اس کی اہل وعیال کی ضرورت پوری کرنے کا کیا ذریعہ ہوگا؟ طے ہوا کہ خلیفہ بقدر کفاف بیت المال سے وظیفہ لے سکتا ہے۔ اس فیصلے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ کس قدر ہونا چاہئے' مختلف تجاویز پیش ہوئیں' لیکن حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اس کا فیصلہ وہ خود کریں گے۔

آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کا تعین کس طرح سے کیا؟ انہوں نے کہا کہ دریافت کرو کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم اجرت کس قدر ہے؟ جس قدر اس کی اجرت تھی' آپؓ نے اسی قدر اپنا وظیفہ مقرر کیا۔ رفقاء نے کہا کہ اس میں آپ کا گزارہ کس طرح ہو سکے گا؟ فرمایا جس طرح اس مزدور کا گزارہ ہوتا ہے۔ اگر اس میں میرا گزارہ نہیں ہوگا تو میں مزدور کی اجرت بڑھا دوں گا تاکہ اسی نسبت سے میرے وظیفہ میں اضافہ ہو جائے۔ آپؓ نے فرمایا کہ میرے نزدیک اصول یہ ہونا چاہئے کہ خلیفہ کا وظیفہ مملکت کے کم از کم آمدنی والے محنت کش کے برابر ہوتا کہ اسے احساس ہو کہ اس آمدنی میں غریب کس طرح گزارہ کرتے ہیں اور پھر اس احساس کے تابع وہ افراد مملکت کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی تدابیر اختیار کرے۔'' (شاہکار رسالت، ص:359)

ترکِ دُنیا نہیں:

اس مقام پر میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ دو جوڑے کپڑے اور

روکھا سوکھا کھانا اس لئے نہیں تھا کہ یہ حضرات تارک الدنیا زاہدوں کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔اس قسم کے زہد وتورع کے متعلق ان کا ردعمل یہ تھا کہ

ایک دن حضرت عمرؓ نے کسی زاہد مرتاض کو دیکھا۔اس کے پاس گئے اور ایک درہ مار کر بولے:

''خدا تجھے موت دے،ہمارے دین کا کیوں گلا گھونٹتا ہے۔''(ہیکل)

جو کی روٹی:

جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنا اصول یہ بنا لیا تھا کہ مملکت کا سربراہ اپنا معیارِ زندگی ایسا رکھے جو امت کے ہر فرد کو میسر آ سکتا ہو،جوں جوں امت کے عام معیارِ زندگی کی سطح بلند ہوتی جائے سربراہ مملکت کا معیار بھی اونچا ہوتا چلا جائے،چنانچہ تاریخ میں ہمیں یہ واقع بھی ملتا ہے کہ ایک دفعہ مصر کا گورنر آیا تو حضرت عمرؓ کھانا کھا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کھانے میں جو کی روٹی ہے۔اس نے کہا کہ اب تو مصر سے کافی مقدار میں گیہوں آ رہا ہے،آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپؓ نے فرمایا کہ اس کا مجھے یقین ہے کہ اس وقت مملکت میں ہر فرد کو جو کی روٹی میسر آ رہی ہے۔جس دن آپ مجھے اس کا یقین دلا دیں گے کہ ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے،اس دن میں گیہوں کی روٹی کھالوں گا۔یہ نہیں ہو سکتا کہ مملکت میں ایک بھی فرد ایسا ہو جسے گیہوں کی روٹی میسر نہ آتی ہو،اور سربراہ مملکت گیہوں کی روٹی کھائے۔جب آپ سے کہا گیا کہ آپ اس قدر عسرت کی زندگی بسر کر کے اپنے آپ کو مشقت میں کیوں ڈالتے ہیں؟ تو آپ نے اس کا جو جواب دیا وہ اسلامی مملکت کے سربراہ کے احساس ذمہ داری کا صحیح آئینہ دار ہے،آپ نے فرمایا کہ

میں رعایا کی دیکھ بھال کیسے کر سکتا ہوں جب تک مجھ پر وہی کچھ نہ بیتے جو رعایا پر بیتتی ہے۔(ہیکل)

جب آذربائیجان کا علاقہ فتح ہوا تو جیوش اسلامیہ کے سپہ سالار،حضرت عقبہ بن فرقدؓ نے وہاں کی ایک خاص مٹھائی کے دو ٹوکرے امیر المومنین حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجے۔آپؓ

نے مٹھائی کو چکھا تو بہت پسند فرمایا لیکن اسے کھانے سے پہلے قاصد سے پوچھا کہ اس مٹھائی کو وہاں تمام سپاہیوں نے کھایا ہے؟ قاصد نے جواب دیا کہ نہیں! یہ تو صرف آپؓ کے لئے ہے۔ اس پر آپؓ نے عقبہ کو جو خط لکھا وہ ہمارے پیش نظر نکتہ کی بہترین تفسیر ہے۔ آپؓ نے لکھا:

اللہ کے بندے، امیر المومنین کی طرف سے عقبہ بن فرقدؓ کے نام۔ امابعد۔ فرقد!

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جو کچھ ہمیں اللہ نے عطا کیا ہے وہ نہ تمہاری ذاتی محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے نہ تمہارے ماں باپ کی محنت اور مشقت کا نتیجہ (یہ تمام مسلمانوں کی مشترکہ محنت کا ثمر ہے) اس لئے ہم کوئی چیز ایسی نہیں کھا سکتے جو تمام مسلمانوں کے گھروں میں کافی مقدار میں نہ ہو۔ (شاہکار رسالت)

قادسیہ کی عظیم فتح کی خوشخبری سننے کے بعد، آپؓ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، تاریخ کے صفحات پر آج تک سنہری حروف میں درخشندہ ہے۔ آپؓ نے کہا:

مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کسی کو ضرورت مند دیکھوں، اس کی ضرورت پوری کر دوں۔ جب تک ایک دوسرے کی (انفرادی طور پر) مدد کرنے سے ایسا ہو سکے، ہمیں ایسا کرنا چاہئے۔ جب معاملہ اس سے آگے بڑھ جائے تو ہمیں سب کو مل کر گزر اوقات کرنی چاہئے۔ یہاں تک کہ سب کا معیار زندگی ایک جیسا ہو جائے۔ کاش! تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کس قدر خیال ہے لیکن یہ چیز میرے زبانی سمجھانے کی نہیں۔ عمل کر کے دکھانے کی ہے۔ خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں کہ تم لوگوں کو اپنا محکوم اور غلام بنا کر رکھوں۔ میں تو خود خدا کا محکوم اور غلام ہوں۔ حکمرانی کی یہ امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اسے اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھ لوں، بلکہ تمہارے چیز تمہاری طرف لوٹا دوں اور تمہارے پیچھے تمہاری خدمت کے لئے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو یہ وہ سعادت ہو گی جو تمہارے ذریعہ مجھے میسر آ جائے گی لیکن اگر میں اس امانت کو اپنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور اپنے گھر پر آنے کے لئے مجبور کر دوں تو یہ وہ بدبختی ہو گی جو تمہارے ذریعے میرے سر

پر مسلط ہو جائے گی۔ (خدا مجھے اس سے محفوظ رکھے)''۔ (شاہکار رسالت)

عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے:

یہ تو پھر بھی مٹھائی تھی' جب حجاز میں قحط پڑا تو حالات بڑے نازک ہو گئے تھے اور آپؓ کی ضبط خویش اور خود فراموشی کی شدت انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن آپؓ نے دیکھا آپؓ کا پوتا ککڑی (یا تربوز) کھا رہا ہے۔ (حضرت) عبداللہ بن عمرؓ کو بلایا اور ڈانٹ کر کہا کہ ''محمدؐ کی امت بھوکی مر رہی ہے اور عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے؟'' بیٹے نے کہا کہ ابا جان! خفا نہ ہو جئے۔ عمرؓ کے پوتے کو ''پھل'' کسی خصوصی امتیاز کی بنا پر نہیں ملا۔ صبح کے ناشتے میں بچوں کو جو کھجوریں ملی تھیں' اس نے ایک بدو لڑکے سے ان کے عوض یہ ککڑی (یا تربوز) خرید لیا تھا۔

یہ عمرؓ کی پوتی تھی!:

ایک دن گلی میں دیکھا کہ ایک بچی جا رہی ہے--زرد رو' نحیف و نزار--اسے دیکھ کر آپؓ کو بڑا صدمہ ہوا۔ پوچھا' یہ کس کی بچی ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ کہا کہ ''یہ امیر المومنین کی پوتی ہے!'' فرمایا کہ ''اس کی ایسی حالت کیوں ہے؟'' کہا کہ ''اس قحط میں جو ملتا ہے' بدوؤں کے بچے تو اس کے عادی ہیں لیکن ہمارے بچے اس کے عادی نہیں۔ اس لئے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ فرمایا کہ ''حالت کچھ بھی ہو' اس عالمگیر مصیبت میں کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کیا جا سکتا۔''

ہم نے شروع میں بتایا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ تمام افراد مملکت کی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں۔ اس کے لئے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی تھیں لیکن احتیاط یہ برتی جاتی تھی کہ کسی شخص کو اپنی ضرورت کے لئے (اور تو اور' خود) خلیفہ کے سامنے بھی ہاتھ نہ پھیلانا پڑے کیونکہ اس سے صاحبِ احتیاج کی عزتِ نفس کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس حقیقت سے مملکت کا ہر فرد واقف تھا اور کس حد تک واقف تھا' اس کے لئے ایک ایسا واقعہ سامنے آتا ہے کہ خود حضرت عمرؓ بھی جب اسے یاد کرتے تھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔

شام کے ویرانے کی بڑھیا:

آپؓ شام کے سفر سے واپس آ رہے تھے تو راستے میں ایک خیمہ دیکھا--ویرانے میں ایک خیمہ! قریب گئے۔تو دیکھا کہ اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔اس سے پوچھا کہ ''تمہیں عمرؓ کا بھی کچھ حال معلوم ہے؟''اس نے کہا کہ ''سنا ہے کہ وہ شام سے چل پڑا ہے۔اس سے زیادہ نہ مجھے اس کی بابت کچھ علم ہے' نہ معلوم کرنے کی ضرورت۔'' آپؓ نے پوچھا کہ ''ایسا کیوں؟''اس نے کہا کہ ''جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں گی؟''آپؓ نے کہا کہ ''تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی؟''اس نے کہا کہ ''یہ میرا کام نہیں تھا' عمرؓ کا کام تھا۔''آپؓ نے کہا کہ ''عمرؓ کو اتنی دور کا حال کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟''اس کے جواب میں اس بڑھیا نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔اس نے کہا کہ

> اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور کہتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے' مجھے شام کی اس بڑھیا نے بتایا۔

خداوندا! خدائی دردِ سر ہے

اسی کا احساس تھا کہ آپؓ نے ایک دفعہ فرمایا کہ

> اگر میں زندہ رہا تو رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے سال بھر تک مسلسل سفر میں رہوں گا--کیونکہ دور دراز علاقوں کے لوگ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے عمال ان میں سے ہر ایک کی ضروریات سے مجھے آگاہ کرتے ہوں۔میں شام' جزیرہ' مصر' بحرین' بصرہ جاؤں گا اور ہر مقام پر دو دو ماہ قیام کر کے لوگوں کے حالات براہ راست معلوم کروں گا۔

لیکن عمر نے ایفا نہ کی اور اس دورہ کا موقع ہی نہ ملا۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ قرآن کے اس معاشی نظام کی یہ عظیم عمارت کن بنیادوں پر استوار تھی، جس کی عالم تاب اور عدیم النظیر مثالیں اس شاہنشاہِ بوریہ نشینؐ اور آپ کے رفقائے کرامؓ کی زندگی سے پیش کی گئی ہیں تو اس کا جواب دولفظوں میں دیا جا سکتا ہے کہ یہ عمارت عدل و احسان کی بنیادوں پر استوار تھی۔ عدل و احسان کے درخشندہ اصول کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی حوض میں چشمہ ابلتا ہے۔ جب حوض بھر جاتا ہے تو اس کا زائد پانی باہر نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ پانی کس طرف جاتا ہے؟ نشیب کی طرف۔ یعنی اس نچلی سطح کی طرف جہاں پانی نہیں ہوا۔ جب وہ گڑھے بھی بھر جاتے ہیں تو پانی آگے جانا شروع ہو جاتا ہے۔ حوض کا اپنی گنجائش کے مطابق پانی رکھ لینا عدل ہے اور فالتو پانی کو ان گڑھوں کی طرف منتقل کر دینا، جہاں اس کی ضرورت ہے، احسان ہے۔ اس طرح حوض اور اس کے گردوپیش میں پانی کا (Level) ہموار ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اسلام کا معاشی نظام جس میں امیر اور غریب کے طبقات ختم ہو جاتے ہیں اور انسانیت کی سطح ہموار ہو جاتی ہے۔ امیر اور غریب کے طبقات تو زمانہ نزول قرآن میں بھی موجود تھے لیکن انہوں نے اس زمانے میں ایسی عالم گیر حیثیت اختیار نہیں کی تھی جیسی اس دور میں ہو چکی ہے۔ بایں ہمہ حضورؐ کی نگہء بصیرت نے اس حقیقت کو اس زمانے میں دیکھ لیا تھا کہ اگر یہ خلیج وسیع ہو گئی تو اس سے کس قسم کے خطرات نمودار ہوں گے۔ اسے حضورؐ نے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا۔ فرمایا:

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے، کچھ نیچے کے حصے میں، جو نچلے حصہ میں تھے، وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے۔ اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا، بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو (پانی دے کر) اس سے روکا نہ گیا تو ظاہر ہے کہ اوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر روک دیا گیا تو سب بچ جائیں گے۔
>
> (ترمذی جلد دوم، ابواب فتن)

حضورؐ نے جس خطرہ سے چودہ سو سال پہلے متنبہ کیا تھا وہ اس دور میں بڑی تیزی سے نمودار ہوتا نظر آ رہا ہے۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ؟

ہم بات یہ کر رہے تھے کہ قرآن کے معاشی نظام کی عمارت ''عدل و احسان'' کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے یعنی ضرورت سے زائد اس طرف لوٹا دیا جائے' جس طرف اس کی کمی ہے۔ قرآن کریم نے اس عظیم اصول کو ایک مختصر سی آیت میں سمٹا دیا ہے جب کہا کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) ''اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے' وہ سب کا سب''۔ حوض نے فالتو پانی رکھنا کاہے کے لئے ہے؟ اس نظام میں زائد از ضرورت کسی کے پاس رہتا ہی نہیں۔ مسلم کی ایک روایت سے اس ارشاد خداوندی کی عملی تفسیر یوں سامنے آتی ہے:

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ ہم رسولؐ اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو وہ اس آدمی کو دے دے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِراہ زیادہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِراہ نہ ہو۔ اس طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔

مسلم ہی کی ایک اور روایت ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ بندہ میرا مال میرا مال کہتا ہے۔ حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ (1) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے۔ (2) جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے اور (3) جو کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے دے کر اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے' وہ یا تو چلا جاتا ہے۔ یا وہ اسے دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

مال و دولت جمع نہیں کئے جا سکتے:

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے جو مال و دولت کو جمع کرنے سے سختی سے روکا ہے تو یہ اصول، اسلامی مملکت کے نظام میں کس طرح فٹ بیٹھتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (9:34)

جو لوگ چاندی سونا (مال و دولت) جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں (ضرورت مند کی ضرورت رفع کرنے کے لئے) کھلا نہیں رکھتے تو انہیں الم انگیز عذاب سے آگاہ کر دے۔

اسلامی مملکت میں:

(1) تمام افراد مملکت کی ضروریات زندگی کا پورا کرنا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔

(2) مملکت کا یہ فریضہ اس طرح پورا ہوتا ہے کہ ہر فرد کا سب (یعنی جو کمانے قابل ہو) پوری پوری محنت سے کمائے۔ اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر باقی مملکت کے لئے کھلا چھوڑ دے تا کہ وہ اسے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے کام میں لائے۔

(3) اس اصول پر سب سے پہلے خود رئیسِ مملکت کاربند ہوتا ہے اور اس کا طرزِ عمل دوسروں کے لئے نمونہ ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کا ترکہ:

اس سے ایک اور حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ جب اصول یہ ٹھہرا کہ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زائد اپنے پاس رکھ نہیں سکتا۔ تو ایسے معاشرہ میں جائدادیں کھڑی کرنے اور

انہیں ترکہ میں چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس لئے حضورؐ نے واضح الفاظ میں فرمادیا تھا کہ:

میرے ورثہ میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی ضروریات کے بعد جو کچھ بھی بچے صدقہ ہوگا۔(بخاری)

اس سلسلے کی اگلی کڑی وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مرض الموت کے ایام میں حضور ﷺ کے ہاں سات دینار تھے اور حضور ﷺ فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کردو لیکن اس کے بعد حضور ﷺ پر غشی طاری ہوگئی اور سب لوگ آپ ﷺ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔آپ ﷺ کو ہوش آیا تو فرمایا:

وہ دینار لے آؤ' دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمد ﷺ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا جبکہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کردیا۔(یعنی بیت المال میں بھیج دیا)(اصح السیر ۔حکیم داناپوری)

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آنحضرتؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔

اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم' نہ غلام نہ لونڈی اور نہ کوئی اور چیز سوائے اپنے خچر کے اور اپنے ہتھیار کے اور اس زمین کے جسے آپؐ نے صدقہ کر دیا تھا۔مولانا شبلی (مرحوم) نے ''سیرۃ النبیؐ'' میں ''متروکات'' کے عنوان کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے:

آنحضرتؐ نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات اور جائداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپؐ اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے جو وفات کے بعد چھوڑ جاتے۔اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔

میں نے ایک نوجوان طالب علم سے جب یہ اصول بیان کیا کہ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زائد اپنے پاس کچھ نہیں رکھے گا تو اس نے کچھ طنزیہ انداز سے کہا کہ انسان اپنی ضروریات کا

سلسلہ تو ختم نہیں ہوتا۔ اس کا تعین کون کرے گا کہ فلاں کے پاس زائد از ضرورت ہے۔ میں نے نہایت سکون سے جواب دیا کہ اس کا تعین وہ خود کرے گا۔ وہ کیسے کرے گا سنو!

اسلامی مملکت کے سربراہ حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک دن کھانے کے بعد بیوی سے کہا کوئی میٹھی چیز اگر ہو تو دیجئے۔ اس نے کہا بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز شامل نہیں -- بات آئی گئی ہو گئی۔ ہفتہ عشرہ کے بعد آپؓ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ تھوڑا سا حلوہ بھی ہے۔ آپؓ نے بیوی سے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ راشن میں کوئی میٹھی چیز نہیں آتی' یہ حلوہ کیسے پک گیا؟ اس نے کہا: ''میں ان دنوں مٹھی بھر آٹا الگ رکھتی گئی۔ جب وہ کافی ہو گیا تو اس کے عوض بازار سے کھجور کا شیرہ منگوا لیا اور حلوہ پکا لیا۔'' آپؓ کھانا کھانے سے فارغ ہو کر سیدھے بیت المال گئے' اور راشن بانٹنے والے سے کہا کہ ہمارے لئے روزانہ جس قدر آٹا جاتا ہے' اس میں ایک مٹھی کی کمی کر دی جائے کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ آٹے کی موجودہ مقدار ہماری روزانہ ضرورت سے بقدر ایک مٹھی کے زیادہ ہے۔''

ہمیں یہ باتیں آج افسانہ سی نظر آتی ہیں لیکن یہ افسانے نہیں' حقیقتیں ہیں۔ جب دین کے تقاضے اعماق قلب سے ابھریں تو اس میں یہ سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ دین کا قیام انہی افراد کے ہاتھوں عمل میں آ سکتا ہے جن کی ذات میں اس قسم کا تغیر آ چکا اور جن کے قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا ہو چکی ہو۔ نگاہ کی تبدیلی سے انسانی کیریکٹر میں کس قسم کی تبدیلی آ جاتی ہے۔ اس کی مثالوں سے ہمارے اس دور کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ جب مدائن فتح ہوا تو فوج کے سپاہی وہاں سے شہنشاہ ایران کے موتیوں کے ہار' جواہرات کا مرصع تاج اور زر کے ریشمی ملبوسات لے کر آئے جن میں جوہرات ٹکے ہوئے تھے۔

جب اس مال غنیمت کا خمس (پانچواں حصہ) مدینہ پہنچا تو اہل مدینہ کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں ان کا ذہن اسے باور نہیں کرتا تھا۔ ساٹھ مربع گز کا تو صرف ایک قالین تھا جس پر مملکت کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس کی زمین سونے کی تھی' جا بجا موتیوں کی نہریں تھیں۔ کناروں پر چمنستان تھا جس پر منقوش درختوں کے تنے سونے کے' پتے ریشم کے اور پھل جواہرات کے تھے۔

حضرت سعدؓ نے لکھا تھا کہ یہ تمام زر و جواہرات مسلمان سپاہیوں کے قبضے میں تھے اور ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ لا کر اپنے قائد کے سامنے رکھ دیا۔ یہ معلوم ہونے پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکے گی؟ اس کے جواب میں جو کچھ حضرت علیؓ نے فرمایا اس دیانت اور امانت کا راز اس میں تھا۔ آپؓ نے فرمایا کہ

چونکہ آپ ﷺ کا دامن پاک ہے اس لئے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔

اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو اس کی نیت میں بھی فرق آ جاتا۔ (بحوالہ ہیکل)

اس دیانت اور امانت کی ابتدا خود اپنے گھر سے ہوتی تھی۔ حضرت معیقیبؓ بیت المال کے خزانچی تھے۔ ایک دن بیت المال سے جھاڑو دینے لگے تو کوڑے میں سے ایک درہم (یوں سمجھئے کہ اس وقت کا چھوٹے سے چھوٹا سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کا بلاوا آ گیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپؓ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ معیقیبؓ! میں نے تمہارے ساتھ کونسی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا؟ تم سوچو کہ قیامت کے دن جب امت محمد یہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا؟

آپؓ کا معمول تھا کہ جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے:

میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بچیں گے اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے جو چاہے حدود سے تجاوز کرے، جو چاہے ان کے اندر رہے۔

(شاہکار رسالت)

یہ ہیں چند ایک جھلکیاں سربراہان مملکت اسلامی (محمد رسولؐ والذینؓ معہٗ) کی اس سیرت مقدسہ کی جو دنیا کے ارباب فکر و عمل کو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اگر تم انسانیت کی سطح بلند کرنا چاہتے ہو تو اسکا طریق یہ ہے کہ تم نوع انسان کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ اور اپنی سیرت و کردار کو بلند کرتے جاؤ۔ اس طرح جس قدر تم خود بلند ہوتے جاؤ گے اسی نسبت سے انسانیت اوپر کو اٹھتی چلی جائے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبالؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ ؎

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تختِ کسریٰ زیر پائے امتشؐ

اس شہنشاہ بوریانشینؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک درخشندہ نقش، جہان کشور کشائی و فرمانروائی کے اس عظیم راز کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ جو صاحبِ ہمت اس بارِ امانت کو اٹھائے، وہ خود تخت کے اوپر نہ بیٹھے۔ تخت کے اوپر قوم کو بٹھائے اور اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کی سطح کو بلند کرتا جائے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن کی پیش کردہ مستقل اقدار پر انسان کا اٹل ایمان ہو اور وہ زندگی کے اس نقشہ کو اپنا نصب العین قرار دے جسے محمد رسولؐ اللہ والذینؓ معہٗ کے مقدس ہاتھوں نے عملاً مرتب کر کے دکھایا تھا۔ جس دن دنیا نے اس راز کو پالیا اور اس ماڈل کو اپنا مطلوب و مقصود قرار دے لیا۔ یہ جہنم جس میں اس وقت سازی دنیا مبتلائے عذاب ہے۔ جنتِ ارضی سے بدل جائے گا اور زمین سر اٹھا کر آسمان سے کہہ سکے گی کہ

دیدہِ آغازم ۔ انجامم نگر!

اور عالمِ ملکوت کی نور پاش فضاؤں سے تبریک و تہنیت کے یہ نغماتِ جانفزا، ساکنانِ ارض کے فردوس گوش بنیں گے کہ

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا
(33:56)

عالمگیر ربوبیت:

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اسلامی مملکت کی یہ ذمہ داری صرف اپنی مملکت کے افراد تک محدود نہیں۔ اس کا دائرہ بڑا وسیع ہے اور تمام عالم انسانیت کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ ''اپنی مملکت'' تو وہ معمل (لیبارٹری) ہوتی ہے جس میں سب سے پہلے اس نظام کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ جوں جوں ان افراد مملکت کی ضروریات پوری ہوتی چلی جاتی ہیں، عالمگیر ربوبیت کے اس دائرے کی حدیں آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا منتہیٰ پوری کی پوری نوع انسانی کی پرورش اور نشوونما ہے۔ اس سلسلہ میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ فرق تو دور حاضر کی قومیت پرستی۔۔نیشنلزم کی لعنت کا پیدا کردہ ہے جس نے انسانوں کو خودساختہ معیاروں کے مطابق مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دنیا کو بعضکم لبعض عدو کا الم انگیز جہنم بنا رکھا ہے۔ اسلامی نظام اس تفریق کو مٹانے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ جس نظام کے سربراہ کا یہ اعلان ہو کہ ''اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی ذمہ داری عمرؓ کے سر ہوگی۔'' اس نظام میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ جو شخص بھوک سے کراہ رہا ہے وہ اپنی مملکت کا باشندہ ہے یا کسی دوسری مملکت کا۔ وہ اپنی قوم کا فرد ہے یا غیر قوم کا۔ وہ کالا ہے یا گورا۔ وہ عربی ہے یا عجمی۔ وہ مسلمان ہے یا کافر! اس نظام میں اس کی قطعاً تمیز نہیں کی جائے گی۔ اس میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے لانے والے رسولؐ کا خطاب نہ کسی خاص خطہ زمین کے لوگوں سے تھا، نہ کسی خاص قبیلہ، نسل یا قوم کے افراد سے۔ اس کا خطاب پوری نوعِ انسانی سے تھا جب اس نے کہا تھا کہ

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (7:158)

اے نوع انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا پیامبر ہوں۔

اور اسی جہت سے اس رسول کو بھیجنے والے خدا نے اعلان کر دیا تھا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (21:107)

ہم نے تجھے اقوام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رحمت کے معنی ہیں سامان نشوونما جو بلا مزد و معاوضہ دیا جائے -- اور ''نشوونما'' میں انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی تربیت اور ارتقاء سب آ جاتے ہیں۔ لہٰذا حضورؐ کے ظہورِ قدسی کا مقصد یہ تھا کہ عالمگیر انسانیت کی اس طرح نشوونما ہوتی جائے کہ صحنِ چمنِ عالم میں کوئی غنچہ بن کھلے مرجھا نہ جائے۔ اسی رحمۃ اللعالمینی کا تقاضا تھا جس کی وجہ سے آپؐ نے روم کے شہنشاہ کو لکھا تھا کہ:

اگر تم نے صحیح راستہ اختیار نہ کیا تو تمہاری مملکت میں مظلوم کاشتکاروں پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں اس کا سارا بار تمہاری گردن پر ہوگا اور ہم پر یہ فرض ہو جائے گا کہ ان مظلوموں کو اس ظلم سے بچائیں۔

ہزار ہزار بار سلام و رحمت ہو نوعِ انسانی کے اس محسنِ اعظمؐ پر جس نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ جو شخص انسانوں کے معاملات سنوارنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے اس کی اپنی زندگی کیسی ہونی چاہئے۔ یہی وہ حیاتِ طیبہ ہے جس کے نقوش زندگی کی شاہراہ پر تابندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتے اور کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کا سراغ دیتے ہیں۔ زمانے کی ریگِ رواں پر اگر یہ نقوشِ قدم نہ ہوں تو کوئی راہرو اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
بزمِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

پروین